بسم اللہ الرحمن الرحیم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَاتَمِ الأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِين، نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِين، أَمَّا بَعْدُ:

# 23-شرح العقیدۃ الواسطیۃ

العقیدۃ الواسطیۃ الشیخ الاسلام الامام ابو العباس احمد ابن تیمیہ رحمہ اللہ، شرح فضیلۃ الشیخ العلامہ محمد بن صالح ابن عثیمین رحمہ اللہ۔

اور جہاں پر رُکے تھے وہیں سے درس کا آغاز کرتے ہیں شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وما وصف به نفسه في أعظم آية في كتاب الله حيث يقول: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾(البقرۃ:255)"۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ اسماء وصفات کے باب میں اب چند آیات اور سورتیں بیان کر رہے ہیں، پچھلے درس میں سورۃ الاخلاص سے ان دلائل کا آغاز کیا تھا شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اور آج کی نشست میں قرآن مجید کی سب سے عظیم آیت آیت الکرسی کو بطور دلیل پیش کر رہے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ذکر ہے اور شیخ صاحب جیسے آگے بیان کریں گے (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ) شرح میں کہ اس عظیم آیت میں پانچ (5) اللہ تعالیٰ کے نام ہیں اور تقریباً چھبیس (26) صفات ہیں۔

تو آیئے دیکھتے ہیں شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کی شرح میں اور کس طریقے سے انہوں نے اسماء وصفات کے باب میں اللہ تعالیٰ کے پانچ (5) ناموں کا ذکر کیا اور ان چھبیس (26) صفات کا اور مختصر تفسیر سمجھ لیں اس عظیم آیت کی۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں "وهذه الآية تسمى آية الكرسي" (اور یہ آیت جو ہے اسے آیت الکرسی کہا جاتا ہے) "لأن فيها ذكر الكرسي" (کیونکہ اس میں کرسی کا ذکر ہے (آیت الکرسی کیوں کہا جاتا ہے؟ کیونکہ اس میں آیت الکرسی ہے یا کرسی کا ذکر ہے اس آیت میں))، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ (اللہ تعالیٰ کی کرسی جو ہے وہ زمین و آسمان کو وسیع ہے)، اور یہ آیت جو ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب (یعنی قرآن مجید) کی سب سے عظیم آیت ہے اور اس کی دلیل کہ یہ آیت جو ہے سب سے عظیم آیت ہے قرآن مجید کی کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ سیدنا أبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ سیدنا أبی بن کعب رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں "فقال له: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ فضرب على صدره، وقال : ليهنك العلم أبا المنذر" (تو اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اُن کا جواب سنا تو اس جواب کی تائید میں اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا أبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر اپنا ہاتھ مارا ہے اور فرمایا کہ آپ کو علم مبارک ہو اے أبا المنذر!)۔

((اور یہ حدیث صحیح مسلم میں موجود ہے))۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اقرار کیا ہے سیدنا أبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے اس جواب کو سن کر کہ قرآن مجید کی سب سے عظیم آیت یہی آیت ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 255 ہے اور اسے آیت الکرسی کہا جاتا ہے، اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ سیدنا أبی رضی اللہ عنہ (سیدنا أبی بن کعب) جو ہیں وہ قرآن مجید کا علم بھی رکھتے تھے۔

اور شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ ایک بنیادی بات سمجھانے کے لیے فرماتے ہیں کہ کیا قرآن مجید کی جو آیات ہیں ان میں تفاضل ہے (ایک آیت دوسرے سے بہتر ہے) یا نہیں ہے جبکہ یہ سب آیات اور سب سورتیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں تو جب ایک ہی عظیم ذات کا کلام ہے تو اس میں کیا تفاوت ہو سکتا ہے یا نہیں ہو سکتا ہے اور تفاضل اگر ہے تو کس طریقے سے ہے؟

وہ فرماتے ہیں اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید میں تفاضل موجود ہے جیسا کہ سورۃ الاخلاص کی حدیث میں بیان کیا تھا اور یہاں پر آیت الکرسی میں بھی اس کا ذکر ہے لیکن اس میں تفضیل بیان کرنا لازمی ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ کیا تفاضل ہے کہ نہیں ہے؟ اس کا جواب کیا ہے؟ جواب میں تفصیل ہے "المتكلم به" جو ہے، یعنی جس ذات کا یہ کلام ہے اس اعتبار سے تو قرآن مجید میں کوئی تفاضل نہیں ہے کیونکہ ایک ہی ذات کا کلام ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ، لیکن مدلولات اور موضاعات کے اعتبار سے قرآن مجید کی آیات میں تفاضل موجود ہے یعنی جیسا کہ سورۃ الاخلاص جو ہے جس میں صرف اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ سورۃ المسد کی طرح نہیں ہے جس میں ابو لہب کی حالت کا بیان ہے۔

تو ایک اعتبار تو یہ ہے کہ جو مدلول ہے جو موضوع ہے سورتوں کا اس موضوع یا مدلول کے اختلاف کی وجہ سے یہ تفاضل موجود ہے اس کی پہلی مثال شیخ صاحب رحمہ اللہ نے یہ دی ہے کہ سورۃ المسد کو دیکھ لیں اور سورۃ الاخلاص کو دیکھ لیں، اب ترتیب دیکھیں کہ "سورۃ المسد پھر سورۃ الاخلاص پھر سورۃ الفلق پھر سورۃ الناس" یہ آخری چار سورتیں ہیں قرآن مجید کی اب سورۃ المسد کا موضوع دیکھ لیں اور سورۃ الاخلاص کا موضوع دیکھ لیں اس اعتبار سے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں کوئی فرق نہیں ہے کوئی تفاضل نہیں ہے کیونکہ ایک ہی ذات کا کلام ہے، اگر آپ موضوع کو دیکھ لیں تو اس میں تو تفاضل ہے اب جو پیغام سورۃ المسد میں ہے وہ پیغام سورۃ الاخلاص میں نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اعتبار سے اخلاص کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے اعتبار سے تو اس اعتبار سے یہ تفاضل موجود ہے کہ سورۃ الاخلاص سورۃ المسد سے افضل ہے۔

اور اسی طریقے سے جو دوسرے تفاضل ہیں قرآن مجید کی سورتوں میں شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ) "يتفاضل من حيث التأثير والقوة في الأسلوب" قوت اسلوب اور دل پر اس کے اثر کے اعتبار سے یہ فرق بھی موجود ہے اور اس سے یہ تفاضل بھی موجود ہے، یعنی شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ) کہ بعض آیتیں ایسی ہیں جو بہت ہی چھوٹی ہیں لیکن ان سے دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے جس میں ردع بھی ہے اور اس میں موعظہ بھی موجود ہوتا ہے، اور دوسری آیت جو اس سے زیادہ لمبی ہے بہت زیادہ لمبی ہے اس کے مقابلے میں (اس آیت کے مقابلے میں) لیکن اس

میں یہ چیز موجود نہیں ہوتی جو اس چھوٹی سی آیت میں موجود ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورۃ البقرۃ میں یعنی جو سب سے لمبی آیت ہے جسے آیت دَین بھی کہا جاتا ہے ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾ إلى آخر الآية (البقرۃ:282)۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں اس آیت کا موضوع جو ہے بہت ہی آسان ہے اور اس کو جب ہم دیکھتے ہیں یہ وہ معاملات ہیں جو لوگوں کے بیچ میں چلتے رہتے ہیں (یعنی قرض کے تعلق سے) اور اس آیت میں یہ تاثیر جو ہے جو دلوں پر اثر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موجود ہے سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران:185)، ((سبحان اللہ))۔

اب جو سب سے لمبی آیت ہے قرآن مجید کی اُس آیت میں قرض کا ذکر ہے کہ قرض کیسے لیا جاتا ہے پھر کس طریقے سے اس کو لکھا جاتا ہے، کون لکھے گا اور کون کہے گا اور کس طریقے سے تو یہ تفصیل ہے، اب جب یہ آیت پڑھتے ہیں دل کی کیا حالت ہوتی ہے اور جب یہ آیت پڑھتے ہیں سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 185 جس میں موت کا ذکر ہے دل پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے!

اب ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اور موت یقینی چیز ہے ہر نفس نے موت کا مزا چکھنا ہے ہر زندہ چیز نے مرنا ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾۔ ﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (تمہارے جو اُجر ہیں وہ قیامت کے دن تمہیں ملیں گے)۔ حساب اُس دن ہوگا۔ کب ہوگا؟ مرنے کے بعد ہوگا۔

((تو پہلے تو موت کا صدمہ ہے اور پھر حساب بھی دینا ہے))۔

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (پس جو جہنم کی آگ سے ہٹا دیا گیا تھوڑا سا دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا) ﴿فَقَدْ فَازَ﴾ (یقیناً وہ کامیاب ہو گیا) ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ

﴿الْغُرُوْرِ﴾ اور دنیا کی جو زندگی ہے جو اس وقت ہم زندہ ہیں اس کے بعد موت نے آنا ہے پھر حساب نے آنا ہے پھر دوزخ ہے جنت ہے یہ سب چیزیں ہیں دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ ﴿مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (صرف اور صرف دھوکے کا متاع ہے (اور کچھ بھی نہیں ہے! سبحان اللہ))۔

تو شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو معنی ہے وہ عظیم معنی ہے اس میں زجر بھی ہے موعظ بھی ہے ترغیب بھی ہے ترہیب بھی ہے اور یہ سب چیزیں قرآن مجید کی جو سب سے لمبی آیت ہے آیت دَین میں یہ چیزیں موجود نہیں ہیں۔ یہ مقدمے کے طور پر شیخ صاحب (رحمہ اللہ) نے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو تفاضل آیتوں میں موجود ہے لیکن کس اعتبار سے؟ اس کے مدلول کے اعتبار سے، موضوع کے اعتبار سے اور دل پر اس کا اثر ہونے کے اعتبار سے، لیکن کس کا فرمان ہے یہ پاک کلام کس کا ہے کس ذات کا ہے اس اعتبار سے کوئی تفاضل نہیں ہے سب برابر ہیں۔ یعنی اگر آپ سورۃ المسد پڑھتے ہیں ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ اور پڑھتے ہیں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ اُجر میں کوئی فرق ہے؟ کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک حرف سورۃ المسد کا اور ایک حرف سورۃ الاخلاص کا اُجر برابر ہے کہ نہیں؟ برابر ہے۔ تو پھر تفاضل کہاں ہے؟ اس اعتبار سے کوئی تفاضل نہیں ہے کہ کس ذات کا کلام ہے (اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے اس میں تفاضل نہیں ہے اس میں برابری ہے) لیکن موضوع کے اعتبار سے دل پر اس کا اثر ہونے کے اعتبار سے یہ تفاضل موجود ہے۔

پھر آیت الکرسی کے تعلق سے ایک مختصر سی تفسیر شیخ صاحب نے بیان کی ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہمیں خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد سچا معبود ہے الوہیت میں منفرد ہے اور یہ کہاں سے ملے گا ہمیں؟ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾، کیونکہ یہ جملہ جو ہے اس میں حصر موجود ہے کہ نفی ہے ﴿لَآ اِلٰهَ﴾ میں اور پھر اثبات ہے ﴿اِلَّا هُوَ﴾ میں۔ تو نفی اور اثبات اس طریقے سے ایک ساتھ بیان ہوتا ہے تو اس میں حصر کا صیغہ ہوتا ہے (یعنی صرف اور صرف)۔

﴿اَلْحَيُّ﴾اور﴿الْقَيُّوْمُ﴾:﴿اَلْحَيُّ﴾سے مراد زندہ۔یعنی اگر کوئی سوال پوچھے اللہ کون ہے؟﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (اللہ وہ ذات ہے جو سچا معبود ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے(کوئی سچا معبود نہیں ہے)وہ زندہ ہے اور وہ قیوم ہے)۔

تو﴿اَلْحَيُّ﴾کا کیا معنی ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں"أي: ذو الحياة الكاملة" (کامل زندگی والا)۔اور اس کو کامل زندگی کیوں کہا جاتا ہے؟ جس میں جو متضمن ہے تمام صفات الکمال کا۔وہ کیسے؟ زندگی﴿اَلْحَيُّ﴾نام ہے اور صفت جو ہے الحیاۃ(زندگی) کی اور یہ صفت جو ہے اس میں تمام جو صفات الکمال ہیں شامل ہیں،یعنی اس زندگی سے پہلے عدم نہیں تھا(اس سے پہلے عدم نہیں ہے)اور پھر اس کا زوال بھی نہیں ہوگا کبھی خاتمہ بھی نہیں ہوگا اور اس میں کسی بھی طریقے سے کوئی نقص کا امکان ہی نہیں ہے کسی اعتبار سے بھی۔

یعنی مخلوق کی زندگی دیکھ لیں آپ کہ ہم بھی زندہ ہیں اس زندگی سے پہلے کیا تھا؟عدم۔اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہم پیدا ہوئے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو ہم عدم تھے،اور پھر اس زندگی کے بعد موت بھی ہے زندگی فنا ہو جائے گی اور پھر اس زندگی میں جو ہم رہتے ہیں کتنے نقص موجود ہیں ہماری زندگی میں تو زندگی بھی ہماری کامل زندگی نہیں ہے۔

آگے تفصیل آئے گی کہ مخلوق کی زندگی میں جو نقص ہے اسی نقص میں اس کا کمال ہے،یعنی ہمیں بھوک لگتی ہے جسے بھوک نہیں لگتی وہ مریض ہے۔بھوک بذات خود ایک نقص ہے لیکن اسی نقص میں ہمارا کمال ہے کیونکہ ہم محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے ہی پیدا کیا ہے۔بھوک لگتی ہے پیاس لگتی ہے،قضائے حاجت کی ضرورت پڑتی ہے،بیمار ہوتے ہیں،اور تکلیفیں ہوتی ہیں درد محسوس ہوتے ہیں یہ سارے ہمارے اندر نقص ہیں۔آپ کو پتہ ہے کہ درد اگر نہ ہو انسان کو محسوس تو یہ الگ سے ایک بیماری سمجھی جاتی ہے۔

اور آپ کو پتہ ہے جو سب سے خبیث یا سب سے بُری بیماریاں جو ہوتی ہیں جیسا کہ کینسر وغیرہ اُس میں بڑی مصیبت کیا ہے پتہ ہے؟ کہ اس کا ڈائیگنوز(Diagnose)بہت لیٹ ہوتا ہے(تشخیص بہت لیٹ ہوتی ہے)وہ اس لیے کہ اس میں درد نہیں ہوتا۔دیکھیں تھوڑا سا سَر میں درد ہو تھوڑا سا چھوٹا سا پھوڑا نکلتا ہے کسی کے جسم میں(جسم کے کسی حصے

میں) دوڑتے ہیں دوائی لینے کے لیے۔ کیوں؟ درد ہوتا ہے۔ تو درد بذات خود کیا اچھی چیز ہے؟ نہیں! کون برداشت کرتا ہے لیکن ہے نقص! ہمارے لیے یہ نقص جو ہے اس میں کمال ہے (سبحان اللہ)۔

بھوک نقص ہے لیکن اس بھوک میں ہمارا کمال ہے (سبحان اللہ)۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جو زندگی ہے وہ کامل زندگی ہے اور ﴿اَلْحَيُّ﴾ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ (اللہ تعالیٰ مردے سے زندہ پیدا کرتا ہے) (الأنعام: 95) جیسا کہ سورۃ الأنعام میں ذکر کیا ہے۔

لیکن دو حَيّ ایک جیسے نہیں ہوتے اور نام کے اشتراک میں مسمی میں تماثل یا برابری لازم نہیں آتی۔

اب الحي قرآن مجید میں یہ لفظ جو ہے دو طریقے سے بیان ہوا ہے:

(۱) ایک اللہ تعالیٰ کے لیے ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾، ﴿اَلْحَيُّ﴾ (زندہ)، یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے الحي۔

(۲) اور دوسرا ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ یہاں پر بھی الحي ہے۔

اب مخلوق میں بھی الحي ہے خالق بھی الحي ہے اب قدر مشترک کیا ہے دونوں میں؟ "الحي" (الحیاۃ)۔ لیکن کیا جن دونوں کا یہ نام ہے کیا دونوں ذاتیں ایک جیسی ہیں؟ تو نام کے ایک جیسا ہونے سے لازمی نہیں کہ دونوں ذاتیں بھی ایک جیسی ہوں، ایک مسمی ہے ایک اسم ہے۔ (الحي اسم ہے، مسمی جس کا یہ نام ہے)۔ کس کا نام ہے؟ خالق کا بھی نام ہے مخلوق کا بھی نام ہے تو اس قدر اشتراک میں صرف نام کی حد تک جو ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس کا یہ نام ہے یا جس ذات کا یہ نام ہے اُن میں بھی یہ قدر مشترک موجود ہو اور برابری یہ تماثل یہ تشابہ موجود ہو۔

پھر ﴿اَلْقَيُّوْمُ﴾ "على وزن فيعول" یہ صیغ المبالغہ میں سے ہے جو قیام سے لیا گیا ہے، قیوم کا معنی یہ ہے کہ یہ وہ ذات ہے جو خود قائم ہے "قائم بنفسه"، اور اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ جو ذات خود قائم ہو کسی اور کی محتاج نہ ہو وہ ذات بے پرواہ ہوتی ہے کسی کی محتاج نہیں ہوتی ہے، نہ اسے کھانے پینے یا کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا

غیر ہے وہ خود قائم نہیں ہوتا وہ کسی اور کا محتاج ہوتا ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اپنے وجود میں اپنے قیام میں اور اس کی اِعداد میں تیاری میں یا اس کی اِمداد میں اور مدد میں۔

توانسان جو ہے مخلوق جو ہے وہ محتاج ہے مخلوق کبھی قیوم ہو نہیں سکتی، قیوم وہ ہے جو کسی کا محتاج نہیں ہوتا جو خود قائم ہے (اللہ تعالیٰ خود قائم ہے)۔

اور اس کا دوسرا معنی یہ بھی ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ''أنه قائم على غيره''(اور دوسروں پر بھی قائم ہے)، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿اَفَمَنۡ هُوَ قَآئِمٌۢ عَلٰى كُلِّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ﴾ إلى آخر الآية،((اور اس آیت میں) اللہ تعالیٰ قائم ہے ہر نفس پر جو کچھ اس نے کمایا ہے)(الرعد: 33)،اور اس میں جو مقابل ہے وہ محذوف ہے اور اس کی تقدیر ہے ''كمن ليس كذلك''۔

یعنی ایک ذات وہ ہے جو ہر نفس پر قائم ہے اور اس کے مقابلے میں وہ ہے جو ایسا نہیں ہے (جو قائم نہیں کسی پر) لیکن اس کا ذکر آیت میں نہیں ہے اور عربی لغت کی یہ خوبصورتی ہے کہ جب جملہ تقابل میں ہے اس طریقے سے تو دوسرے کو محذوف کر دیا جاتا ہے۔﴿اَفَمَنۡ هُوَ قَآئِمٌۢ عَلٰى كُلِّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ﴾ تو کس کے مقابلے میں بات ہو رہی ہے؟ یعنی ''كمن ليس كذلك''، ایک طرف وہ جو قائم ہے ہر نفس پر، دوسرا وہ جو قائم نہیں ہے۔ جو نہیں ہے قائم اس کا ذکر بھی نہیں کیا کیونکہ اس کا وجود ہی نہیں ہے (سبحان اللہ)۔

اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب نفس پر قائم ہے جو کچھ وہ کماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ''قائم بنفسه وقائم على غيره''، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ﴾۔

اور تیسری بات یہ ہے یہاں پر کہ جو محتاج ہے اپنے قیام اور وجود کے لیے اللہ تعالیٰ کا وہ اپنے وجود کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں سے ﴿وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ﴾(کہ بے شک آسمان و زمین اللہ کے حکم سے قائم ہیں)(الروم: 25)۔ شیخ صاحب فرماتے ہیں، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ملک اور افعال بھی کاملہ ہیں۔

اور پھر "الحي القيوم" شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دو پیارے نام ہیں جنہیں اسم أعظم بھی کہا جاتا ہے یہ وہ نام ہیں اللہ تعالیٰ کے دونوں جب ان سے پکارا جائے اللہ تعالیٰ کو تو دعا قبول ہوتی ہے رَد نہیں ہوتی اس لیے (شیخ صاحب فرماتے ہیں) انسان کو چاہیے کہ اپنی دعا میں ان دو ناموں کو وسیلہ بنا کر دعا کیا کرے اور یوں کہے "ياحي! يا قيوم!"۔

جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے "يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ" (اے زندہ! اے قیوم! میں تیری رحمت سے استغاثہ کرتا ہوں)۔

پیاری دعا ہے "يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ" اس میں اللہ تعالیٰ کے دو پیارے ناموں "الحي، القيوم" سے وسیلہ لیا جا رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو وسیلہ بنایا جا رہا ہے اور استغاثہ کہ میں شدید تکلیف میں ہوں اللہ تعالیٰ تو اپنی رحمت سے رحم فرما تُو حَی ہے تُو قیوم ہے (سبحان اللہ)۔

اور یہ دونوں نام ایک ساتھ (شیخ صاحب فرماتے ہیں) بیان ہوئے ہیں قرآن مجید میں تین جگہوں پر:

1-سب سے پہلے آیت الکرسی میں ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾۔

2-﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (آل عمران: 2)، وہی جملہ ہے آیت الکرسی والا (سبحان اللہ)۔

3-تیسرا جو ہے تیسری جگہ سورۃ طہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا﴾ (طہ: 111)۔ اور اس میں بھی دیکھیں "الحي القيوم" ایک ساتھ دونوں بیان ہوئے ہیں۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں، ان دونوں ناموں میں ذاتی کمال اور سلطانی کمال ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کا کمال جو ہے وہ ہے ﴿اَلْحَيُّ﴾ کے لفظ میں اور سلطان کا کمال جو ہے وہ ﴿الْقَيُّوْمُ﴾ کے لفظ میں ہے یا القیوم کے نام میں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ذاتی اور سلطان یا ربوبیت کے اعتبار سے جو ہے کامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قائم ہے۔

پھر اگلا جملہ ﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ ((اس میں نفی ہے دو چیزوں کی) نہ تو اونگھ اسے لیتی ہے اور نہ ہی نیند)۔ سِنَة کہتے ہیں اونگھ کو اور اونگھ سے مراد نیند کی ابتداء، جو مقدمہ ہوتا ہے ابتداء ہوتی ہے ہر چیز کی تو نیند کی ابتداء کو سِنَة کہا جاتا ہے، یہ نہیں فرمایا ہے "لا ينام" (سوتا نہیں ہے)۔

کیا فرق ہے لاینام اور ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾؟ کیونکہ نیند جو ہے اختیار سے ہوتی ہے مرضی سے انسان سوتا ہے لیکن ''الأخذ يكون بالقهر'' لینا زبردستی ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ پر کوئی نہ غلبہ ہو سکتا ہے اونگھ کا نہ نیند کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات انسان پریشان ہوتا ہے سونا نہیں چاہتا لیکن نیند آ ہی جاتی ہے نیند غالب ہو جاتی ہے اسے۔ نہیں ہوتی؟! کیونکہ انسان مسکین ہے حقیر ہے فقیر ہے محتاج ہے نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھیں بیٹھے بیٹھے آپ بے ہوش ہو جاتے ہیں گم ہو جاتے ہیں تو نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے أخذ لے لیتی ہے ہمیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی نفی کر دی ہے۔ اب لاینام میں وہ معنی نہیں ہے کیونکہ انسان کبھی نہیں سونا چاہتا تو کسی حد تک نہیں سوتا۔ دونوں کے لفظ میں دیکھیں کتنا فرق ہے۔

اب ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ نیند اُس پر غالب نہیں آسکتی، اونگھ بھی نہیں آسکتی اور نہ ہی نیند (سبحان اللہ)۔ اور سونے کی صفت جو ہے یہ صفت نقص ہے، اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ''إِنَّ اللَّهَ لاَ يَنَامُ وَلاَ يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنَامَ'' (اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے لیے سونا جو ہے وہ ممکن ہے (یا نہ ہی اللہ تعالیٰ کو سونا چاہیے))۔

((یہ صحیح مسلم کی حدیث میں آیا ہے))۔

وہ کیوں؟ یہ صفۃ النفی ہے ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾، اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جب صفۃ منفیۃ کا ذکر ہو تو اس میں کمال ضد جو ہے (اس کی ضد میں جو ہے) اس کو ثابت کرنا لازم ہوتا ہے اور اصل مقصد اس کی جو ضد ہے اس کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔

اس میں کیا کمال ہے ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾؟ ''كمال الحياة وقيومية''۔ "الحي القيوم" کس حد تک حَیّ القیوم ہے؟ ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾۔ اب ان دونوں ناموں کو (سبحان اللہ) مزید تاکید کے ساتھ اور اس کا جو کمال ہے اسے بیان کرنا مقصود ہے کیونکہ جس کی حیات کاملہ ہے اس میں نیند کا امکان ہی نہیں ہے ورنہ نقص ہو جاتا زندگی میں۔

آپ کو پتہ ہے نیند جو ہے اسے بھی موت کہا گیا ہے، انسان جب سو یا پڑا ہوتا ہے تو کہتے ہیں دیکھو مرا پڑا ہے (ایسے کہتے ہیں نا یعنی اس کو کوئی پتہ ہی نہیں ہے دنیا کا)، اونگھ بھی اسی کا حصہ ہے ابتداء ہے اور بے ہوشی بھی۔ یعنی یہ تمام چیزیں جو ہیں یہ جن میں انسان بالکل دنیا سے کٹ آف (Cut Off) ہو جاتا ہے کسی خاص وقت کے لیے تو دنیا میں نقص ہے کہ نہیں ہے؟ زندگی میں نقص ہے کہ نہیں ہے؟ اس میں نقص ہے۔ لیکن جب اس کی نفی کر دی گئی ہے ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ تو حیات کاملہ ہے۔ قیومیت بھی اس سے جڑی ہے کہ اب جو تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا ہے اور ذمے دار ہے اپنے ماتحت لوگوں کا تو سوتے وقت اُن کی ذمہ داری کس کے ذمے ہے کون خیال رکھے گا؟ تو قیومیت کا بھی کمال ہے اور زندگی کا بھی کمال ہے، ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ اب اس ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ کی مزید تاکید اور کمال بیان کرنے کے لیے ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾۔

"لأنه من كمال حياته أن لا يحتاج إلى النوم ومن كمال قيوميته أن لا ينام" (تو سونے کی نہ ضرورت ہے نہ حاجت ہے اور نہ ہی (سبحان اللہ) اللہ تعالیٰ کو نیند آتی ہے) "لأن النوم إنما يحتاج إليه المخلوقات الحية" (جو زندہ مخلوقات ہیں ان کو نیند کی ضرورت ہوتی ہے)، کیونکہ نقص ہے خود ناقص ہے۔

نیند کی کیوں ضرورت پڑتی ہے کیوں حاجت ہوتی ہے؟ کیونکہ آرام کی ضرورت پڑتی ہے۔ آرام کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ کیونکہ تھکن ہوتی ہے۔ پہلے کام کرنے کی وجہ سے تھکن ہوتی ہے اور پھر مزید کام کرنے کے لیے چستی دوبارہ ہونے کے لیے بیچ میں ایک چیز کی ضرورت ہے وہ کیا ہے؟ نیند (نہیں!)۔ مخلوق کو دیکھ لیں، آپ اپنے آپ کو دیکھ لیں ہمیں دیکھ لیں ہم کام کرتے ہیں ڈیوٹی کرتے ہیں تھک جاتے ہیں تو دوپہر کو تھوڑا سا قیلولہ کر لیتے ہیں بیچ میں آدھا گھنٹہ سو جاتے ہیں جب اٹھتے ہیں تو چستی ہوتی ہے کہ نہیں؟ وجہ کیا ہے؟ کہ جو تھکن وہ ختم ہو گئی اور مزید اگلی ڈیوٹی کے لیے جو کام کرنا ہے اس کے لیے بھی آسانی ہو گئی ہے۔

اگر آپ مسلسل کام کریں نہ سوئیں رات تک دیکھیں اپنی حالت اس وقت دیکھیں کیسی ہوتی ہے، اور بیچ میں تھوڑا سا سو کر دیکھیں پھر حالت دیکھیں کیسی ہوتی ہے۔

تو نیند کی ضرورت کب پڑتی ہے؟اس تھکن کو دور کرنے کے لیے،اور تھکن بھی دونوں اعتبار سے ہو سکتی ہے زندگی میں بھی نقص ہے اور قیومیت میں بھی نقص ہے اور دونوں سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

اور اسی طریقے سے (شیخ صاحب فرماتے ہیں) جیسا کہ اہل الجنۃ ہیں جو جنتی ہیں اُن کی زندگی کامل ہے کیونکہ وہ سوتے نہیں ہیں جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے نیند نہیں آتی۔

جنت میں کوئی نیند نہیں ہے ضرورت نہیں ہے نیند کی،نہ کوئی تھکان ہے نہ کچھ ہے مزے ہی مزے ہیں نیند ہی نہیں ہے وہاں پر۔ بھوک بھی نہیں ہے پتہ؟! نہ بھوک ہے نہ نیند ہے،نہ کوئی حاجت ہے کسی چیز کی) پھر کھائیں گے کیوں؟ مزے کے لیے۔ قضائے حاجت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جو وہ کھائے گا وہ کہاں جائے گا؟ جو جنتی کھاتے ہیں وہ کہاں جاتا ہے؟ وہ مُشک بن کر نکل جاتا ہے جیسا کہ پسینہ آتا ہے نا اُس اعتبار سے وہ بھی مُشک ہوتا ہے اُس میں بہت خوشبو ہوتی ہے (سبحان اللہ)۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ)،اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نیند تو انسان میں کمال ہے اس لیے انسان کو اگر نیند نہ آئے یا وہ نہ سوئے تو اسے مریض کہا جاتا ہے،اور اسی طریقے سے کھانا جو ہے انسان کے لیے کمال ہے اگر نہیں کھائے گا تو اسے بھوک نہیں لگے گی تو اسے مریض کہا جاتا ہے اور یہ جو ایک اعتبار سے کمال ہے دوسرے اعتبار سے نقص ہے کہ جو تندرست ہے اور اس کا جو جسم ہے وہ ٹھیک ہے تو اسے کھانے کی ضرورت پڑتی ہے وہ کھاتا ہے اور جب اس تندرستی میں کمی ہو جاتی ہے اور مرض کی ابتداء ہو جاتی ہے مریض ہو جاتا ہے تو بھوک میں بھی کمی ہو جاتی ہے۔ یہ جو حاجت ہے کھانے پینے کی تندرستی کی علامت ہے یہ کمال ہے جو حقیقت میں کیا ہے؟ نقص ہے نا،محتاجی تو ہے نا (سبحان اللہ) لیکن اس نقص میں ہمارا کمال ہے۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ) ''إذاً ليس كل كمال نسبي بالنسبة للمخلوق يكون كمالاً للخالق'' (جو کمال نسبی ہوتے ہیں (جیسے نسبی کمال جن میں کمال بھی ہے نقص بھی ہے دونوں پائے جاتے ہیں یہ نسبی کمال ہیں) جو کمال نسبی مخلوق میں ہیں ہر طریقے کا لازمی نہیں ہے کہ وہ خالق کے لیے بھی کمال ہو) ''كما أنه ليس كل كمال في الخالق يكون كمالاً في المخلوق'' (جیسا کہ کھانا پینا ہے مخلوق کے لیے کمال ہے خالق کے لیے نقص ہے)۔ ہر اعتبار سے نقص ہے

کیونکہ حاجت ہے اور اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے حاجت روا ہے۔اور جو خود محتاج ہے اور حاجت روا دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا؟ نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!

اور اسی طریقے سے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ جو خالق میں کمال ہے ہر اعتبار سے مخلوق میں بھی وہ نقص ہو سکتا ہے جیسا کہ تکبر ہے "المتکبر" اللہ تعالیٰ کا کمال ہے لیکن مخلوق میں تکبر اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، "فالتكبر كمال في الخالق نقص في المخلوق والأكل والشرب والنوم كمال في المخلوق نقص في الخالق" ((سبحان اللہ) کہ تکبر جو ہے وہ خالق کے حق میں کمال ہے اور مخلوق کے حق میں جو ہے نقص ہے، اور کھانا پینا جو ہے اور سونا جو ہے وہ مخلوق کے حق میں کمال ہے اور خالق کے حق میں نقص ہے)، اس لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اپنے تعلق سے ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ (وہ کھانا کھلاتا ہے لیکن کھاتا نہیں ہے یا کھلایا نہیں جاتا (خود اللہ تعالیٰ کھانا کھلاتا ہے رزق عطا فرماتا ہے لیکن کوئی اور اللہ تعالیٰ کو نہیں کھلاتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہے)) (الأنعام:14)۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾، شیخ صاحب فرماتے ہیں ﴿لَه﴾ جو ہے یہ خبر مقدم ہے ﴿وَمَا﴾ جو ہے مبتدأ مؤخر ہے تو اس جملے میں حصر ہے کہ اس چیز کو آگے کرنا جس کا حق پیچھے رہنا ہے خبر مبتدأ کے پیچھے اور بعد میں ہوتا ہے ہمیشہ جب اُس کو آگے بیان کیا جاتا ہے مبتدأ سے پہلے اسے صیغ الحصر کا جاتا ہے۔ ﴿لَه﴾ جو ہے لام ملکیت کے لیے ہے اور یہ جو ملکیت ہے اللہ تعالیٰ کی تام ہے اور کامل ملک ہے بغیر کسی معارض کے۔ ﴿مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ (جو کچھ آسمانوں میں ہے)، اور آسمانوں میں فرشتے ہیں، جنت وغیرہ جو کچھ بھی ہے وہ جو ہم جانتے ہیں اور وہ جو ہم نہیں جانتے وہ تمام چیزیں جو بھی آسمانوں میں ہیں وہ سب شامل ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہیں اللہ تعالیٰ کی ہیں، ﴿وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (اور جو کچھ زمین میں ہے)، تمام مخلوقات میں جیسا کہ حیوان ہیں یا حیوان کے علاوہ جو بھی چیزیں ہیں مخلوقات ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

اور ﴿السَّمٰوٰتِ﴾ کا لفظ جمع کا ہے یعنی (شیخ صاحب فرماتے ہیں) اس سے مراد بہت سارے آسمان ہیں اور قرآن مجید میں یہ دلیل موجود ہے کہ سات آسمان ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ

﴿الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ (کہہ دیں اے میرے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان کو کہ سات آسمانوں کا ربّ کون ہے وہ ربّ عظیم کون ہے؟)(المؤمنون:86)۔

اور اسی طریقے سے جو زمینیں ہیں قرآن مجید میں اشارہ ہے کہ سات ہیں بغیر تصریح کے لیکن سنت میں یا احادیث میں اس کا صراحتاً ذکر ہوا ہے کہ سات زمینیں ہیں جو قرآن مجید میں اشارتاً اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورۃ الطلاق میں ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ (اللہ تعالیٰ نے ہی سات آسمان پیدا کیے اور ان جیسی زمینوں کو بھی پیدا کیا ہے)(الطلاق:12)۔ آسمانوں کی مثل زمین تو مثل سے کیا مراد ہے کس اعتبار سے؟ یعنی "مثلهن في العدد دون الصفة"۔ ظاہر ہے زمین آسمان کی طرح تو نہیں ہے صفت کے اعتبار سے تو کیا چیز باقی رہتی ہے؟ عدد۔ نمبر کے اعتبار سے کہ سات آسمان ہیں تو زمینیں بھی سات ہیں لیکن جو مزید وضاحت ہے وہ سنت میں اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان میں جو متفق علیہ حدیث ہے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "مَنِ اقْتَطَعَ شِبْرًا مِنَ الأَرْضِ ظُلْمًا طَوَّقَهُ اللَّهُ بِهِ يَومَ القِيَامَةِ مِن سَبْعِ أَرَضِينَ" (کہ جس نے بھی ناجائز ایک بالشت کسی کی زمین پر قبضہ کیا ہے ظلم کیا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ساتویں زمین تک اس کے گلے میں طوق ڈال دے گا اس زمین کا)۔

ایک بالشت زمین صرف قبضہ کیا ہے ناجائز قبضہ کیا ہے کسی پر ظلم کیا ہے اُس کی زمین کو ہتھیا لیا ہے تو قیامت کے دن کیا سزا ہو گی میدان محشر میں؟ یہ زمین کا جو ٹکڑا ہے نا ایک بالشت وہ ساتویں زمین تک اسے الگ کیا جائے گا اور اس کی گردن میں وہ طوق ڈالا جائے گا (نعوذ باللہ)۔

((تو اس حدیث میں یہ واضح ہے کہ کتنی زمینیں ہیں؟ سات زمینیں ہیں))۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾، ﴿مَنْ ذَا﴾ میں اسم استفہام ہے ﴿مَنْ﴾ جو ہے اور ﴿ذَا﴾ جو ہے ملغاۃ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ﴿ذَا﴾ جو ہے اسم موصول ہے ﴿الَّذِيْ﴾ کی طرح کیونکہ جملہ پھر کیا ہو گا؟ "من الذي الذي"۔ اصل لفظ کیا ہے؟ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ﴾۔

تو﴿مَنْ﴾ تو اسم استفہام ہے سوال ہے کہ کون؟ ﴿ذَا﴾ اگر اسم موصول کہیں "من الذي" اصل تو یہ ہونا چاہیے نا تو ﴿الَّذِیْ﴾ جو بعد میں ہے وہ کیا ہے پھر؟ "من ذا الذي الذي" تو نہیں ہو سکتا، تو ﴿ذَا﴾ جو ہے ملغاۃ ہے یعنی اس کا لفظ تو موجود ہے لیکن اس کا معنی موجود نہیں ہے۔

یعنی دیکھیں انداز بیان کی خوبصورتی دیکھیں کہ جس کا وجود ہی نہیں ہے اس کا صرف لفظ ﴿ذَا﴾ موجود ہے حقیقت میں اس کا وجود ہی نہیں ہے کیونکہ نفی کس چیز کی ہو رہی ہے؟ "کہ کون ہے وہ جو شفاعت کرے اللہ تعالیٰ کے ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر"۔ کوئی ہے؟ جب کوئی نہیں ہے تو ﴿ذَا﴾ بھی نہیں ہے (سبحان اللہ)، اسے کہتے ہیں انداز بیان کی خوبصورتی۔ "من الذي" بھی ہو سکتا ہے "من الذي يشفع عنده إلا بإذنه" ایک یہ جملہ اور ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ تو زیادہ تاثیر کس میں ہے؟ سبحان اللہ دیکھیں دل پر کس کا گہرا اثر ہوتا ہے؟ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ﴾۔

﴿یَشْفَعُ﴾ "الشفاعة"۔ شفاعت لغت میں کہ کسی طاق کو جفت بنانا شفعا کا لفظ جو ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَّ الشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ﴾ (الفجر: 3)، اور اصطلاح میں "التوسط للغير بجلب منفعة أو دفع مضرة" (بیچ میں آ کر کسی اور کے لیے منفعت حاصل کرنا یا نقصان سے اسے بچانا (نقصان کو دفع کرنا))۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت جو ہے حساب کتاب شروع کرنے کے لیے "لأهل الموقف" جو ہے یہ شفاعت کس لیے ہے؟ نقصان سے بچانے کے لیے ہے۔

شدید تکلیف ہو گی پچاس ہزار سال کا دن ہے میدان محشر میں اور قیامت قائم نہیں ہو رہی (لمبی حدیث ہے شفاعت کی) لوگ جائیں گے سیدنا آدم کے پاس پھر سیدنا نوح کے پاس، سیدنا ابراہیم کے پاس (علیہم الصلاۃ والسلام) اس طریقے سے سب سے آخر میں آئیں گے اللہ تعالیٰ کے آخری نبی سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پھر فرمائیں گے "أنا لَهَا" (میں شفاعت کروں گا)، پھر عرش کے نیچے سجدہ ریز ہوتے ہیں اللہ أعلم کتنے لمبے عرصے تک، پھر اللہ تعالیٰ جو ہے

وہ اجازت دے گا اور پھر حساب شروع ہو گا۔ تو یہ شفاعت جسے شفاعت عظمیٰ بھی کہتے ہیں اور یہ شفاعت کس لیے ہے ؟نقصان سے بچانے کے لیے ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت جو جنت والوں کے لیے ہو گی کہ جنت میں داخل ہو جائیں جب دستک ہو دروازے پر۔ اب جنت کا فیصلہ ہو گیا ہے پُل صراط بھی پار ہو گئی ہے اب جنتی جنت میں داخل ہونے کے لیے رُکے ہوئے ہیں کیوں رُکے ہیں؟ دروازہ بند ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دستک نہیں دیں گے اپنے دستک مبارک سے دروازہ جنت کا کھلے گا نہیں کسی کے لیے بھی نہیں، تمام انبیاء (علیہم الصلاۃ والسلام) اور تمام امتی سب پیچھے کھڑے ہیں جب تک دروازہ نہیں کھلے گا جنت کا کوئی جنت کے اندر جا نہیں سکتا (سبحان اللہ)۔

تو یہ جو شفاعت ہے جنت کا دروازہ کھولنے کی یہ بھی شفاعت ہے لیکن کسی نقصان سے بچنے کے لیے یا نفع حاصل کرنے کے لیے نفع پانے کے لیے؟ کوئی نفع حاصل کرنے کے لیے ہے نا کیونکہ شفاعت کی تعریف کیا ہے؟ کہ کسی کے لیے نفع حاصل کرنے کے لیے یا نقصان سے اسے بچانے کے لیے بیچ میں آ کر یہ عمل کرنا۔ اب نقصان سے بچنے کے لیے تو پتہ چل گیا ہے شفاعۃ العظمیٰ جو ہے حساب شروع کرنے کے لیے یا تکلیف سے بچانے نقصان سے بچانے کے لیے ضرر کو دفع کرنے کے لیے، اور جنت میں داخل ہونا جو منفعۃ ہے سب کے لیے فائدہ ہے سب کے لیے تو یہ شفاعت جو منفعۃ کے لیے ہے وہ شفاعت جو تھی شفاعۃ العظمیٰ جو ہے وہ دفع مضرۃ کے لیے ہے۔

﴿عِنْدَهٗٓ﴾ ''أي: عند الله'' (اللہ تعالیٰ کے ہاں) ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (مگر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے (اللہ تعالیٰ کے اعلام سے))، جب تک اللہ تعالیٰ اس کی اجازت نہیں دے گا تو کوئی شفاعت کر نہیں سکے گا۔ تو اس میں شفاعت کا اثبات کیا جا رہا ہے کہ شفاعت ہو گی لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے اور اگر اس کا یعنی ثبوت نہ ہوتا کہ شفاعت ہو گی تو ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ کے استثناء بے فائدہ ہو جاتا۔

اور اس جملے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بعد ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ جو ملکیت ہے اللہ تعالیٰ کی خاص ملکیت ہے اور اس سے بھی تمام ملک جو ہے سلطان جو ہے اس کا ثبوت ملتا

ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے اس ملکوت میں ملکیت میں جو بھی کائنات ہے اللہ تعالیٰ کی صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک ہے کوئی بھی تصرف کا حق نہیں رکھ سکتا یہاں تک کہ شفاعت سے بھی نہیں۔

شفاعت خیر ہے نا"طلب الخیر للغیر"کسی کے لیے خیر کا طلب کرنا شفاعت ہے نا یہ اسے نقصان سے بچانے کے لیے یا اس کے لیے نفع حاصل کرنے کے لیے۔ تو اگرچہ شفاعت بھی ہے تب بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہے تو اس سے کیا ثبوت ملتا ہے ؟ کہ جو ملکیت ہے اللہ تعالیٰ کی کمال کی ہے اور تمام ہے تام الملک ہے اور کامل ملک ہے اللہ تعالیٰ"وهذا من تمام ربوبيته وسلطانه عز وجل"(یہ بھی ربوبیت اور سلطان کے کمال اور تمام میں سے ہے)۔

اور اس جملے میں شیخ صاحب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اذن سے مراد الأعلام﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ﴾(التوبہ:3) جیسے سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے، یعنی اعلان اور اعلام ہے اور اجازت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

کس چیز کی اجازت ؟ کہ شفاعت ہو گی، اور اس میں ایک تو اجازت ہے کمال ہے دوسرا "اعلام" یہ واضح کرنا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی بھی ہے۔

اور بھی شرطیں ہیں شیخ صاحب فرماتے ہیں شفاعت کی جن میں سے اللہ تعالیٰ کو راضی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہونی چاہیے شافع اور مشفوع له سے (جو شفاعت کر رہا ہے اس سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہو تب اللہ تعالیٰ قبول کرے گا اور جس کی شفاعت کی جارہی ہے اس سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى﴾(اور نہیں شفاعت کرتے مگر جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہو)(الانبیاء:28)۔

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا﴾(اور اس دن شفاعت نفع نہیں دے گی مگر وہ جسے اللہ تعالیٰ اجازت دے اور اللہ تعالیٰ اس کے قول سے راضی ہو)(طہ:109)۔ تو اس میں دو کا ذکر ہے اجازت کا بھی ہے رضا کا ذکر بھی ہے۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ تیسری آیت ہے ایک اور آیت جس میں تینوں شرطیں موجود ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورۃ النجم میں (اسے نوٹ کرلیں اس میں یہ تینوں شرطیں موجود ہیں) ﴿وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ﴾ (اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں) ﴿لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا﴾ (اُن کی شفاعت کوئی کام نہیں آئے گی) ﴿اِلَّا﴾ (مگر)۔ استثناء ہے یعنی اب شفاعت کام آئے گی کیا ہے؟ ﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ (اِلا یہ کہ اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ اجازت دے اجازت کے بعد ﴿لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (جسے چاہے) ﴿وَيَرْضٰى﴾ اور جس سے راضی ہو جائے) (النجم: 26)۔

یعنی ''یرضی عن الشافع والمشفوع''۔ اللہ تعالیٰ کی رضا سے مراد کیا ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو شفاعت کرنے والے پر اور جس کی شفاعت کی جارہی ہے کیونکہ جو معمول کا حذف کیا جارہا ہے اس میں عموم شامل ہو جاتا ہے۔

﴿اِلَّا تَضٰى﴾ کس پر راضی؟ جب اس کا ذکر نہیں ہے کو مفعول ہے یا جسے معمول بھی کہا جاتا ہے تو یہ صیغ العموم میں سے ہے یعنی ہر وہ جو اس رضا میں شامل ہے۔ اس میں ظاہر ہے کون ہے شفاعت میں؟ ''شافع'' (شفاعت کرنے والا) اور ''مشفوع'' (جس کے لیے شفاعت کی جارہی ہے)۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ)، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شفاعت کا فائدہ ہی کیا ہے جب اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے کہ جس کی شفاعت کی جارہی ہے اسے نجات حاصل کرنی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دیتا ہے جو شفاعت کر رہا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اکرام کرے اور مقام محمود بھی وہ اس شفاعت سے حاصل کرلے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص مقام مقامِ محمود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا ہے تو اس کے لیے شفاعت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جتنی کرتے جائیں گے زیادہ اور اللہ تعالیٰ اتنا زیادہ راضی ہوتا جائے گا اور پھر مقامِ محمود بھی جو ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ﴾ علم کے اعتبار سے۔ علم کا مطلب ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ) "هو إدراك الشيء على ما هو عليه إدراكاً جازماً" (کسی چیز کو جاننا جس چیز پر وہ حقیقت ہے یقینی طور پر ادراکاً جازماً)، اور اللہ تعالیٰ عزّوجل ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ یعنی مستقبل میں ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾۔ ﴿وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ جو ماضی (Past) جو گزر چکا ہے، اور ﴿مَا﴾ جو ہے صیغ العموم میں سے ہے یعنی اس میں ماضی مستقبل سب شامل ہیں اور وہ بھی شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کے فعل میں سے ہو چکا ہے اور جو ہے، اور جو مخلوقات کے افعال میں سے ہے سب اس میں شامل ہے۔ اور ﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ﴾: ﴿يُحِيْطُوْنَ﴾ جو ہے یہ خلق کا معنی ہے مخلوق کی طرف اس کا ضمیر ہے کہ احاطہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کے علم کا اور اس کی دلیل میں پہلے گزر چکی ہے ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (کیونکہ ملکیت تمام اللہ تعالیٰ کی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے)، یعنی جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ کر نہیں سکتے مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ ﴿مِّنْ عِلْمِهٖٓ﴾ (اللہ تعالیٰ کے علم میں سے) اس سے شیخ صاحب فرماتے ہیں مراد کہ اس کا احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے علم میں سے کیونکہ ہم کچھ نہیں جانتے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سے مگر وہ جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں اجازت دی ہے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اگر ہمیں یہ خبر نہ دیتا کہ وہ حَی اور قیوم ہے تو ہمیں کہاں سے پتہ چلتا؟! تو اسماء وصفات کے اعتبار سے بھی ہمیں صرف اس چیز کا پتہ ہے جس کو ہمیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔

اور دوسرا یہ بھی احتمال ہے کہ علم سے مراد معلوم ہے جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کا علم ہے معلومات میں سے اُس کا احاطہ کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر وہ جو اللہ تعالیٰ چاہے، اور دونوں معنی صحیح ہیں اور دونوں میں زیادہ عموم ہے اور اس عموم میں جو ہے وہ پہلا معنی بھی شامل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا علم بھی شامل ہے)۔

﴿إِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ یعنی وہ جنہیں اللہ تعالیٰ اس علم میں سے کوئی علم دینا چاہے یا بیان کرنا چاہے۔اور ہم بھی بہت ساری چیزیں جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور احکام کونیہ اور احکام شرعیہ کے تعلق سے اور یہ بہت سب کچھ جو ہم جانتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا جو علم ہے اس کے سامنے بہت ہی کم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾(الاسراء:85)۔اور شاہد کیا ہے اس آیت میں؟ ﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾، جو بھی علم ہمیں دیا گیا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ﴾: ﴿وَسِعَ﴾ سے مراد "شمل"، شیخ صاحب فرماتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی جو کرسی ہے وہ آسمان و زمین کو شامل ہے اور آسمان وزمین سے بھی بڑی ہے کیونکہ اگر کرسی بڑی نہ ہوتی آسمان وزمین سے تو پھر "وسع" کیسے ممکن ہے (اتنی وسیع ہے اللہ تعالیٰ کی جو کرسی ہے آسمان وزمین سے بھی زیادہ بڑی اور وسیع ہے)۔

کرسی کا معنی کیا ہے؟ کرسی کا معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "إنه موضع قدمي الله عزّ وجل" (اللہ تعالیٰ کے قدموں کی جگہ جہاں پر اللہ تعالیٰ کے قدم ہوتے ہیں اس جگہ کو کرسی کہا جاتا ہے)، اور یہ عرش نہیں ہے تو عرش کرسی سے بھی زیادہ بڑا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بے شک تمام آسمان جو ہیں اور ساری زمینیں جو ہیں (یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں) کرسی کی نسبت جو ہے ایسی ہے جیسا کہ صحرا میں ایک حلقة ہے (ایک رنگ ڈال دی جائے) اور عرش کرسی کے سامنے جو ہے یا کرسی عرش کے سامنے جو ہے "كَفَضْلِ الْفَلاةِ عَلَى هَذِهِ الْحَلْقَةِ" ۔

یعنی آپ اگر صحرا میں ایک حلقة ڈال دیں (ایک رنگ ڈال دیں) تو جو تناسب ہے دونوں میں دیکھ لیں اس زمین کے ٹکڑے کا جو بہت بڑا ہے اور اس حلقے کا یا رنگ کا جو آپ نے رکھا ہے، تو کرسی عرش کے سامنے اسی تناسب سے ہے جیسا کہ یہ حلقة جو ہے یہ رنگ جو ہے اس صحرا میں رکھی ہوئی ہے (سبحان اللہ)۔

اور اس سے دلیل ملتی ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ مخلوقات بہت عظیم ہیں اور اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت جو خالق ہے اس کی بھی دلیل ملتی ہے کہ خالق بہت بڑا عظیم ذات ہے۔

﴿وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفۡظُهُمَاۚ وَهُوَ ٱلۡعَلِيُّ ٱلۡعَظِيمُ﴾: ﴿وَلَا يَـُٔودُهُۥ﴾ اس میں بھی نفی ہے کہ بھاری نہیں ہے اور نہ مشکل ہے اللہ تعالیٰ کے لیے آسمانوں اور زمین کی حفاظت کرنا اور یہ صفت منفیۃ میں سے ہے اور اس میں جو صفت ثبوتیۃ ہے جو اس کی ضد میں ہے یہ "كمال القدرة، والعلم، والقوة، والرحمة"۔

اگر کوئی کہے قاعدہ کیا ہے جب نفی کا ذکر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات میں؟ تو اس میں جو اس کی ضد میں جو صفت ثبوتیۃ ہے اس کو ثابت کرنا ہوتا ہے، اب ﴿وَلَا يَـُٔودُهُۥ﴾ اس کی ضد میں جو صفت کمال ہے وہ چار چیزیں ہیں "كمال القدرة، والعلم، والقوة، والرحمة" (قدرت کا کمال، علم کا کمال، قوت اور طاقت کا کمال اور رحمت کا کمال)، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ رحم نہ فرماتا تو پھر حفاظت نہ کرتا تو پھر زمین و آسمان میں کوئی خیر نہ ہوتا (سبحان اللہ)۔

پھر آخری دو لفظ ﴿وَهُوَ ٱلۡعَلِيُّ ٱلۡعَظِيمُ﴾: ﴿ٱلۡعَلِيُّ﴾ جو ہے شیخ صاحب فرماتے ہیں فعیل کے وزن پر ہے اور صفت مشبہۃ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علو جو ہے وہ لازم ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے اور جو فرق ہے اسم فاعل اور صفت مشبہۃ میں کہ اسم فاعل جو ہے وہ طاری ہے (یعنی وقتی طور ممکن ہے)۔ فعل کے ساتھ جب اسم لگ جاتا ہے تو فاعل جب تک فعل کر رہا ہے تو اس کا نام اسم فاعل میں موجود ہوتا ہے، جب اس فعل سے رُک جاتا ہے تو وہ پھر نام باقی نہیں رہتا، اور جو صفت مشبہۃ ہے اس میں ہمیشگی کا معنی پایا جاتا ہے کہ یہ صفت ہمیشہ ہے۔

یعنی ﴿ٱلۡعَلِيُّ﴾ جو ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ علی ہے ہمیشہ بلندی پر ہے، علو کی صفت لازمہ بھی ہے اور اس میں ہمیشگی کا بھی ہے اور یہ صفت مشبہۃ حقیقت میں ہے۔ یعنی عربی گرامر میں دیکھیں تو یہ کون سا لفظ ہے العلی جو ہے اسم ہے، فعل ہے؟ یا اگر اسم ہے تو کون سا اسم ہے؟ اب اسم فاعل "العالی"، لیکن العلی میں وہ معنی ہے جو اس میں نہیں ہے دوسرے لفظ میں العالی میں، العلی صفت مشبہۃ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جو علو ہے جو بلندی کی صفت ہے اس کی دو قسمیں ہیں "علو ذات، وعلو صفات" ایک ذات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ بلندیوں پر ہے اور پھر صفت کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ بلندیوں پر ہے اور جو صفت ہے علو کی اس کی دو قسمیں ہیں "علو القدر اور علو القھر"، شان کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ بلند ہیں اور غلبے کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ بلند ہیں۔

((یہ تفصیل اس لیے ہے کیونکہ مخالفین نے مخالفت کی ہے (اہل بدعت نے اس معاملے میں) اس کا جواب آگے آئے گا ان شاءاللہ))۔

جو علو الذات ہے یعنی جب علو کی بات کرتے ہیں بلندی کی تو تین چیزیں ہمیشہ یاد رکھیں "علو الذات، والعلو القدر، والعلو القهر" ایک ذات کے اعتبار سے اور باقی دو جو صفات ہیں صفت کے اعتبار سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات جو ہے کہاں پر بلندیوں پر ہے؟ عرش سے بھی اوپر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے اوپر ہے اللہ تعالیٰ کے اوپر کوئی چیز بھی نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی چیز ہو سکتی ہے کیونکہ تین چیزیں ہیں کہ اوپر ہے، برابر ہے، نیچے ہے۔ نیچے ممکن نہیں ہے، برابر کوئی ہو نہیں سکتا اللہ تعالیٰ کے، تو پھر اللہ تعالیٰ سب سے اوپر ہے۔

اور صفات کے اعتبار سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ﴾ (النحل:60)، یعنی اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی صفات ہیں سب بلند اور عالی صفات ہیں کیونکہ ان میں کوئی نقص نہیں ہے کسی اعتبار سے بھی۔

﴿الْعَظِيمُ﴾ کہ بھی صفت مشبہۃ ہے اور اس کا معنی "ذو العظمة" (عظمت والا ہے) اور اس میں طاقت اور کبریاء اور جیسے جو معنی ہیں پائے جاتے ہیں سارے جیسا کہ اس لفظ کے مدلول میں شامل ہیں۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو ہے وہ پانچ نام اور چھبیس (26) صفات جو ہیں وہ بیان ہوئی ہیں اگلے درس میں ان شاءاللہ ہم ان پر بات کریں گے یہ پانچ نام کون سے ہیں اور یہ چھبیس (26) جو ہیں وہ کون سی ہیں۔

((واللہ أعلم))۔

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

یہ رسالہ ڈاکٹر مرتضیٰ بن بخش (حفظہ اللہ) کے آڈیو درس (23.العقیدۃ الواسطیۃ) سے لیا گیا ہے۔ سبق لسانی اور تعبیر کی غلطی کو درست نہیں کیا گیا ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر کوئی اور غلطی نظر آئے تو ضرور آگاہ کریں اور اس خیر کے کام میں شامل ہو جائیں۔